کلامِ اکبر اور سر سید: ایک مطالعہ

Kalam-e-Akbar and Sir Syed: A Study

i ڈاکٹر نسیم اختر ii ڈاکٹر محمد مسعود عباسی

Abstract:

Akbar is not against the modern knowledges, but he is not in favour of the blind following of the west, and he is regretted on the loss of the political and educational freedom of the Muslims. We can see satire as a reform in Akbar poetry as a proved fact and he has used his satire as a tool to make radical changes in Sir Syed's movement. Akbar, being a true satirist, can never fully support any reformist movement. His humorous pattern of thinking always tries to rectify the direction of every character and movement. To doubt and to warn are a part of the satirist's nature. Satire is such a whip that awakens the sleeping souls of the masses. Like his other characters, Akbar also satirized the character of Sir Syed. Akbar strongly attacked in the early days with contradictions and satire on Sir Syed but with the passage of time and experiences, he seemed to be much impressed by the struggle and reforming passion of Sir Syed. This article discusses the philosophical and psychological differences between Sir Syed and Akbar along with their mutual harmony and similarities.

Keywords: *Satirist, Reformation Movement, Humorous thinking, Doubt, Warning, Contradictions, Efforts, Similarities, Modern Knowledge, Blind following, Political freedom.*

اکبر جدید علوم کے خلاف نہیں ، لیکن وہ مغرب کی اندھی تقلید کے حق میں بھی نہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی اور تعلیمی آزادی کے ضائع ہونے پر انہیں افسوس ہے۔ ہم اکبر کی شاعری میں طنز کو ایک اصلاح کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے سرسید کی تحریک میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لیے اپنے طنز کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ اکبر ایک طنز نگار ہونے کے ناطے کسی بھی اصلاحی تحریک کی مکمل حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان کا مزاحیہ انداز ہمیشہ ہر کردار اور حرکت کی سمت درست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم شک کرنا اور تنبیہ کرنا طنز نگار کی فطرت کا حصہ ہوتا ہے۔ طنز ایک ایسا کوڑا ہے جو عوام کی سوئی ہوئی روحوں کو جگا دیتا ہے۔ اپنے دوسرے کرداروں کی طرح اکبر نے بھی سرسید کے کردار پر طنز کیا۔ اکبر نے ابتدائی دنوں میں سرسید پر تضادات اور طنز کے ساتھ سخت حملہ کیا لیکن گزرتے وقت اور تجربات کے ساتھ وہ سرسید کی جدوجہد اور اصلاحی جذبے سے بہت زیادہ متاثر نظر آئے۔ اس مضمون میں سرسید اور اکبر کے درمیان فلسفیانہ اور نفسیاتی اختلافات کے ساتھ ساتھ ان کی باہمی ہم آہنگی اور مماثلت پر بھی بحث کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو شاعری ، طنزیہ ، اصلاحی تحریک ، مزاحیہ گفتگو ، شک ، تنبیہ ، تضادات ، کوششیں ، مماثلتیں ، جدید علم ، اندھی پیروی ، سیاسی آزادی۔

اکبر ایک سچے طنز نگار کی طرح کسی بھی اصلاح تحریک کا مکمل طور پر ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ ان کا ظریفانہ طرزِ فکر ہر تحریک اور کردار کا قبلہ درست کرنے کی سعی کرتا رہا۔ تشکیک اور اشتباہ بھی طنز نگاروں کی سرشت میں ہوتا ہے۔ طنز ایک ایسا چابک ہے جو افراد کی خوابیدہ روح کو بیدار کر سکتا ہے۔ اکبر نے بھی مختلف کرداروں کی طرح سر سید کو بھی طنز کا نشانہ بنایا۔ اکبر کی ابتدائی عمر میں تضادات اور طنز کے وار

i اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبہ اُردو ، مسلم یوتھ یونی ورسٹی ، اسلام آباد (Corresponding Author)

ii صدر نشین ، شعبہ اردو ، مسلم یوتھ یونی ورسٹی ، اسلام آباد۔

شدید تھے لیکن تجربات اور عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ وہ کافی حد تک سر سید کی کاوشوں اور اصلاح جذبہ سے متاثر بھی نظر آتے ہیں اس آرٹیکل میں سر سید اور اکبر کے فکری اور ذہنی تضادات کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی ہم آہنگیاں اور مماثلتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جدید علوم کے خلاف نہیں ہے بل کہ وہ مغرب کی اندھی تقلید کا حامی نہیں اور اسے مسلمانوں کی فکری اور سیاسی آزادی کے سلب ہو جانے کا دکھ ہے۔ ہمیں اکبر کی شاعری میں طنز برائے اصلاح کا عنصر نظر آتا ہے اور انھوں نے سر سید کی تحریک میں مثبت تبدیلی کے لیے ہی طنز کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

اکبر کو سر سید سے یہ بھی اختلاف تھا کہ سر سید کے نظامِ تعلیم میں روحانی قدروں کے لیے جگہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اسی وجہ سے یہ ہوا کہ سر سید کو براعظم کے مسلمانوں کی ترقی کی فکر مذہب کی حفاظت سے زیادہ ہی تھی۔

یہی وجہ رہی تھی کہ سید سلمان ندوی کہتے تھے کہ سر سید نے مسلمانوں کو نام کے علاوہ ہر بات کے لیے انگریز بنانے لگے ہوئے تھے اور اکبر کا یہ عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی روایات اپنی اقدار اور اپنے کارناموں پر بھروسا رکھنا چاہیے۔

اور اکبر کا کہنا ہے کہ انھیں نجات کو اپنے ترکے میں تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اکبر سمجھتے تھے کہ جس تعلیم سے قوم اپنی تہذیب و ثقافت اپنی قدروں اور اپنی تاریخ سے الگ ہو جائے یا پھر اپنے رب اور رسول ﷺ کے بنائے ہوئے طریقوں اور احکامات سے دور ہو جائیں تو ایسی تعلیم مسلمانوں کے لیے کسی زہرِ قاتل سے کم نہیں۔ اکبر کہتے ہیں:

تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل
ہاں کفر کے ساتھ جنگ جوئی نہ رہی[۱]

نقل مغرب میں جو چھوڑی آشیانے اپنی اصل
ہٹ گئی شانِ عرب حُسنِ عجم جاتا رہا[۲]

سر سید زوال کے اس دور میں مسلمانوں کی کم علمی اور تہی دامنی سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے مسلمانوں کو نئے علوم و فنون کی اہمیت سے آگاہ کیا اور پھر مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف

ہونے کی بجائے انگریز کی پیروی کو ضروری قرار دیا اس وجہ سے اکبر سر سید کے خلاف تھے حالاں کہ اکبر تو یہ سمجھتے تھے کہ سید صاحب مسلمانوں کا بھلا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کے لیے سید بہت ضروری ہیں۔

بے شک اکبر کو سر سید سے نظریاتی اختلاف بھی تھا۔ لیکن وہ ان کی کوششوں کو بہت سراہتے بھی تھے کیوں کہ انھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کے شعور کو زندہ کیا۔ مگر وہ اِس کی اس سوچ کے خلاف تھے کہ حکمران قوم جو کَہ دے اسے مان لیا جائے اور جو دے اُسے حاصل کر لیا جائے۔

اکبر بھی علامہ اقبال کی طرح خودی کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ پر سر سید نے مادیت اور ظاہری فائدوں کے لیے ہی مسلمانوں کی دوبارہ زندگی کے لیے ضروری سمجھا۔

یہی وجہ رہی تھی کہ انھوں نے انگریزی سیکھنے پر زور دیا اور انگریزی لباس پہنو انگریزی سرکار کے خلاف مت جاؤ اُن کے خیال میں مہذب ہونے کا یہی ثبوت تھا۔ مگر اکبر کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ مسلمان کوٹ پتلون کے شوقین تو ہو گئے پر اُن میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور صلاحیت نہیں رہی تھی۔

ڈاکٹر آصف اعوان اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ”اکبر کو اس بات کا دکھ ہے کہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے نوجوانوں نے اپنی وضع قطع تو بدل لی وہ کوٹ، پتلون، بنگلہ، پاٹ اور صابون کے شوقین ہو گئے تاہم اُن میں وہ سخت کوشی اور قوت خراش مفقود ہو گئی۔ جو زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔“[۳]

اکبر یہ سمجھتے ہیں کہ قوموں کا آغاز یعنی شمشیر و سناں کے جذبہ پر ہوتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے۔ بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے، صابون بھی ہے لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی یورپ کا تری رگوں میں خون بھی ہے۔[۴]

سر سید احمد نے جو تعلیم مسلمانوں کو دی اس کا مسلمانوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ انگریزی لباس کو پسند کرنے لگے اور انگریز کی نوکری پر فخر کرنے لگے اس طرح انھوں نے مسلمانوں کے عقائد کا بیڑا غرق کیا وہ مسلمانوں کی ترقی میں اس حد تک ڈوب گئے کہ ان کو یہ بھی نہ یاد رہا کہ قدرت اور سائنس میں فرق بھی ہے۔ اکبر کہتے ہیں:

کر گئے حضرت سید عقیدوں کو درست
چرخ نے رسموں کا بھی آخر صفایا کر دیا

سر سید نے نیچر اور تدبیر کو حقیقت اور مذہب پر زیادہ اہمیت دی تھی اکبر نے اس حوالے سے بھی سر سید سے اختلاف کیا۔ اکبر کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تعلیم اپنی قدروں اور مذہب سے ہمیشہ جڑے رہنا چاہیے۔ اکبر اور سر سید کے ذہنی رجحانات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"اس زمانے کے حالات اس بات کے حق میں تھے کہ سر سید کی طرح وہ بھی قومی ترقی پر اپنی توجہ مبذول کرتے اور اپنی قوم کو مغرب کے بعض ترقی پسند رجحانات سے قریب تر لانے میں معاون ثابت ہوتے لیکن ہوا یہ کہ یاران تیز گام تو برق رفتاری سے اس پر گامزن ہو گئے اور اکبر خود اپنی زنجیروں میں جکڑے رہ گئے ایک طرح سے زندگی کے بڑے موقع کو گنوا دیا اکبر نے خود اپنی گلونا زکے میدان کو خود ہی محدود کر لیا۔"[۵]

اکبر کا کہنا تھا کہ ہم مانتے ہیں کہ منطق بھی کوئی چیز ہے پر یہ انسان کا ساتھ کہاں تک دے سکتی ہے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ کچھ احکامات قرآن میں ہے اور کچھ احادیث میں بیان کیے ہیں اور کچھ ہمارے اسلاف نے بتا دیے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ اب یہ ضروری تو نہیں ہے کہ جو باتیں ہماری سمجھ میں نہ آئے یا ہم نے انھیں دیکھا نہ ہو تو اس کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر پیدائش آدم کا واقعہ ہمارے سامنے نہیں ہوا تو کیا ہم ڈارون کا نظریہ بندر کا انسان تک کا سفر کو سچ مان لیں گے اور منطق میں یہ بھی کہیں نہیں ہے۔ محض ایک اندازہ ہی ہے کہ شاید سارا عمل ہماری آنکھوں نے دیکھا تھا۔ اس طرح جب انساں کو مرنا ہی پڑے گا تو پھر جواب دینا ہو گا۔ تو حرص ہوس کو چھوڑ کر انسان کو اپنی اصل چیز کو مان لینا چاہیے جو مذہب نے بتائی ہے۔ اکبر کہتے ہیں:

مرنا بھی ضروری ہے خدا بھی ہے کوئی چیز
اے حرص کے بندو ہوس جاہ کہاں تک[۶]

تجھ سے ترک صوم و صلوٰۃ زکوٰۃ و حج
کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا[۷]

سر سید احمد نے ہمیشہ مسلمانوں کے بہتر مستقبل کے لیے کوششیں کی وہ مسلمانوں کی غربت سے بہت پریشان رہتے تھے وہ مسلمانوں کی پستی اور افلاس سے کڑھتے رہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمان اگر اپنی اصل یعنی مذہب اور زبان اور کتاب و سنت سے جڑے رہے اور انگریز کے خلاف بغاوتیں کرتے رہے تو پھر انگریزی سرکار ساری مراعات ہندوؤں اور سکھوں کو دیں گے اور انگریزوں کے جہاں سے چلے جانے کے بعد مسلمانوں کو بہت سی پریشانیاں لاحق ہو جائیں گی اور مسلمانوں کو سکھوں اور ہندوؤں کی غلامی کرنی پڑے گی۔

سید کے خیال میں انگریزی پڑھنا اور مغرب سے تعلقات استوار رکھنا بہت ضروری ہے اُن کا خیال تھا کہ سیاسی بحث میں مسلمانوں کو کامل سکوت کی ضرورت ہے لہٰذا اکبر اُن کی اس بات پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بار بار آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال
حضرت سید سے جا کر عرض کرتا ہے کوئی کاش[۸]

اکبر یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ سیاست اور معیشت میں اپنا حصہ ڈالیں ان کا کہنا تھا کہ اس کے بغیر وہ آزادی حاصل نہیں کر سکتے اکبر دریا کے درمیان میں کسی تختہ کے انتظار میں نہیں رہنا چاہتے تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ خود سے کوئی تختہ ساتھ لے کر جانا چاہیے۔

درمیاں دریا تختہ بندم کردہ
بعض مَسر میگوئی کہ دامن مکن ہشیار باش[۹]

جب سر سید نے یورپ کی راہ اختیار کی تو بہت سارے خیال اُن کے ذہن میں آ رہے تھے کہ مغرب میں اصل تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے کیوں کہ وہ وہاں کی بود و باش وہاں کی شان و شوکت امیر گھروں کی دعوت اور انداز، نازنینوں کے جلوے اور پتلون کوٹ کو تہذیب کا حصہ سمجھنے لگے۔ وہ سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کو مہذب قوم بننے کے لیے انگریز کی طرزِ زندگی اپنانا چاہیے انگریزی لباس تراش خراش اندازِ تکلم اور تہذیب و معاشرت کی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے ایک انگریزی رسائل "Tellor" اور "Espectato" سے متاثر ہو کر رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کو شروع کیا اور اس کے لکھنے والوں پر یہ شرط عائد کی کہ وہ مسلمانوں کو انگریز سرکار سے نفرت کی بجائے اُن سے دوستی اور بہترین تعلقات بنانے کے لیے

تحریریں لکھیں گے:

پتلون و کوٹ و بنگا و بسکٹ کی دھن بندے
سودا جناب کو بھی ہو ترکی کلاہ کا[۱۰]

اکبر کو سر سید سے یہ بھی اختلاف تھا کہ وہ جب سے یورپ سے ہو کر آئے ہیں وہ انگریزی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے ہیں، اکبر سمجھتے تھے کہ سر سید نہ کسی بزرگ عالم کو مانتے ہیں اور نہ کسی پیشوا کو۔

سید کا تعلق قرآن پاک سے واجبی سا رہ گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سید اس نئی تہذیب میں ڈھل کر خدا اور دعا کو زبانی کلامی مانتے ہیں مگر حقیقت میں وہ بادشاہ حکم اور طاقت کو مانتے ہیں۔

زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں
وہ صرف قوت فرما روا کو مانتے ہیں[۱۱]

سر سید وقت اور حالات کو سمجھ رہے تھے اُن کو زمانے کا بخوبی ادراک تھا کہ علمِ جدید کے بغیر دنیا میں ترقی نہیں کی جا سکتی صرف خواب دیکھے جا سکتے ہیں۔

اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے علم کی دولت حاصل کرنی پڑتی ہے اور قدرت کا ہمیشہ یہ طریق رہا کہ بے علم اور بے ہنر لوگ ہمیشہ غلام رہے۔ علم و ہنر سے دور لوگ کبھی بھی آرام و سکون سے نہیں رہ پائے لیکن جو قومیں تعلیم سے جڑی رہیں اُن کا ڈنکا بجتا رہا اسی وجہ سے سر سید نے ایک مدرسہ بہ نام "علی گڈھ" شروع کیا اور اس مدرسہ کے حوالہ سے لوگوں کی گالیاں بھی سنی مگر وہ اپنے مقصد سے نہیں ہٹے اکبر نے ان کے اس کام کو پسند کیا۔

> "سر سید کے تعلیمی نظریات میں انقلابی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے وہ اجتماعی اور قومی تعلیم کا ایک تصور رکھتے ہیں اور اپنے تعلیمی پروگرام کو کسی خاص طبقے تک محدود کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔"[۱۲]

سر سید کے بارے میں اکبر کا یہ کہنا تھا کہ جب سے سر سید یورپ سے واپس آئے تو وہ اپنی تہذیب و معاشرت بھول گئے اور کھانا پینا اُڑھنا بچھونا اٹھان بیٹھنا سب یورپ کی طرز پر ہو گیا۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی سر سید اور اکبر میں اختلافات سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

> "سر سید اور اکبر کے خیالات میں اختلافات کی بنیاد یہ تھی کہ سر سید مغرب کی عقلیت

پسندی اور مذہبی لبرل ازم سے بہت متاثر تھے اور ان خیالات کی وہ بڑی شد و مد سے اپنی قوم میں تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ اکبر ان کی شدت پسندی کو اسلام کی مذہبی اور تہذیبی اقدار کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔"[۱۳]

اکبر کا کہنا ہے سر سید دعائیں چھوڑ کر وظیفہ خوری رکھے ہوئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اصل میں انگریزی حکومت سے دوستی اور وظیفہ خوری سے ہی ہندوستان کا نظام چل سکتا ہے ان کا انگریزوں کی چاپلوسی کرنے کا مقصد یہی تھا۔ ڈاکٹر صفری مہدی کے بقول:

"سر سید اور اکبر میں مماثلت کا سب سے بڑا ثبوت دونوں کا اپنے بیٹوں کو تعلیم کے لیے برطانیہ بھیجنا تھا۔ یعنی دونوں محمود اور عشرت برطانیہ میں زیر تعلیم رہے۔"[۱۴]

اکبر کا کہنا تھا کہ سید صاحب کیوں کہ قوم کو غلامی کی سوچ کی طرف گامزن کر رہے تھے اسی لیے گورنمنٹ ان کے ساتھ تھی اور ان کی ترقی کے چرچے جابجا ہو رہے تھے کبھی لاٹ صاحب کی طرف ان کی دعوت ہوتی تھی تو کبھی وہ لاٹ صاحب کے ساتھ یعنی کسی نہ کسی انگریز افسر کے مہمان بنتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ سید صاحب مذہب میں سائنسی فکر اور قرآنی احکامات کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھنے کی سوچ کے پیچھے بھی یہی انگریزی حکومت ہی تھی اکبر کہتے ہیں کہ سر سید انگریزوں کے ساتھ مل کر شراب پیتے تھے اور پھر انھیں جب شراب پینے کا لطف آ گیا اور وہ عقل سے جاتے رہے یعنی وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے دماغ میں اسلام تو رہا مگر پاؤں کے نیچے شراب خانہ بھی رہا۔

سر سید نے تہذیب و تمدن کو بہتر کرنے کا بیڑا تو اٹھایا تھا مگر ان کے ساتھ مسلمانوں نے اچھا سلوک نہ کیا اور دشمنی پال لی۔ مگر سید پھر بھی تن کر کھڑے رہے۔ اکبر کہتے ہیں:

سر سید کو فلک نے تننے نہ دیا
تہذیب کو پھر دوبارہ جننے نہ دیا[۱۵]

اکبر کا یہ بھی کہنا ہے کہ سر سید یورپ کو اپنا مرشد سمجھتے ہیں اور پھر خود ان کے مرید ہو گئے ہیں، جب ان کو یورپ کا رنگ ڈھنگ نظر آیا تو وہ اس کو من و عن اسی طرح قبول کر بیٹھے کہ جیسے کوئی مرید کامل رہنے پر خاص کی ہر بات کو بلا قیل و قال مان لیتا ہے۔ اکبر اس پر اس طرح طنز کرتے ہیں:

یورپ نے دکھا کے رنگ اپنا سید کو مرید بنا ہی لیا

سب پیروں سے تو وہ بچ نکلے اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی [۱۶]

سر سید پر یورپی تہذیب کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے اپنے مضامین اور اپنے رفقا کے ذریعے اسی تہذیب کو قوموں کے لیے ضروری گردانا بلکہ وہ تو اس حد تک بھی چلے گئے کہ اسی انداز کو مہذب کہنے لگے اور پھر اس کی اشاعت کے لیے کوشش شروع کر دی۔

سر سید کا یہ بھی کہنا تھا کہ مسلمان ہونے کے لیے علی گڑھ سے تعلق ہونا ضروری ہے ان کا کہنا تھا کہ ہر مسلمان پر علی گڑھ سے تعلق اسی طرح فرض ہے۔ جس طرح ارکانِ اسلام، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور مسلمانوں کو بھی علی گڑھ کے لیے چندہ دینا بھی خود پر ایسے فرض سمجھنا چاہیے جیسا کہ جہاد کی آواز پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال پیش کر دیا تھا اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو وہ مسلمان کیسا۔ اس وقت پینٹ کوٹ پہننے والے مسلمانوں کو دوسرے لوگ شک کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کو مسلمانوں کے لیے گناہ کے برابر تصور کرتے تھے۔ اس وقت کچھ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ کوٹ پتلون والا شخص مرتد ہو گیا ہے۔

اکبر کا کہنا ہے سر سید کی خانقاہ میں رہنا قفس کے برابر ہے کیوں کہ قفس میں رہنا بھی قید کی علامت ہی ہے اور سید بھی غلام ذہن اور غلام سوچ پیدا کر رہے تھے سر سید نے بھی مسلمانوں میں کبھی تحریک پیدا کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ وہ تو جنگِ آزادی کو بغاوت ہند قرار دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ترقی صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ وہ انگریز سرکار کی غلامی کریں اور ان کی دی ہوئی تعلیم حاصل کریں ان کا طرز معاشرت اپنائیں۔ اصل میں سر سید کا مطمع نظر مادی اور ظاہری ترقی تھی وہ قید میں رہ کر ہی جینے کی راہ تلاش کرنا چاہتے تھے۔ وہ دوبارہ آزادی کے حصول کو بھول چکے تھے۔

مگر ان تمام کے باوجود بھی اکبر سر سید کے اعلیٰ کاموں کو نہیں بھولے اور اس بات میں وہ یہ کہتے ہیں کہ:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے
یہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں [۱۷]

تاہم شروع میں اکبر کے رویہ میں بہت سختی تھی اور بہت طنز بھی کرتے تھے لیکن بعد میں ان کی طنز کی کاٹ میں وہ شدت نہ رہی عمر اور علم کے ساتھ ان کے خیالات میں تبدیلی آتی گئی اکبر کو قوم کی آزادی

کی فکر تھی جو نامعلوم طور پر سلب کی جا رہی تھی تاہم سارے اختلافات کے باوجود اکبر اور سید میں بہت ساری مماثلتیں بھی تھیں۔

حوالہ جات:

۱۔ اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر، حصہ دوم، ۸۹۔

۲۔ ایضاً، ۱۵۵۔

۳۔ ڈاکٹر محمد آصف اعوان، مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد (اکبر الٰہ آباد اور اقبال) (لاہور: بزم اقبال، جولائی، ۲۰۱۲ء)، ۱۲۱۔

۴۔ اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر، حصہ اول، ۱۵۵۔

۵۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردو ادب میں طنز و مزاح (علی گڑھ: ایجوکیشنل ہاؤس، ۱۹۹۰ء)، ۱۱۰۔

۶۔ اکبر الٰہ آبادی، کلیات اکبر ، ترتیب نو: یوسف مثالی (لاہور: آر۔آر پرنٹرز، ۲۰۱۷ء)، ۲۸۔

۷۔ ایضاً، ۱۷۷۔

۸۔ ایضاً، ۱۸۸۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً، ۱۹۱۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی، سر سید اور ہندوستانی مسلمان (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۹ء)، ۲۰۔

۱۳۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی، اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۱ء)، ۲۶۳۔

۱۴۔ ایضاً، ۲۵۹۔

۱۵۔ ایضاً، ۱۹۵۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ ایضاً۔